# عصر حاضر میں دعوت و تبلیغ کے بدلتے اسالیب اور ان کی رعایت
# (سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں)

# Changing Styles of Dawah and Preaching in Modern Times and their Observances
## (In the light of the Seerah of the Prophet PBUH)

*ڈاکٹر حافظ ناصر علی

**ڈاکٹر اشفاق احمد

**ABSTRACT**

In the era of modern globalization, Da'wah and preaching have become essential to protect the new generation from negativities of directionless modernism. Moreover, this is also a need for time to make Da'wah more ordered, more logical, and more effective through dialogue. For this mastery over new social trends, comprehensive knowledge, awareness of class and cultural dimensions, and specialty in modern sources of communication are needed. The process of opinion-making has not only become vast but also got complicated as globalization has encouraged individual liberty whose effects are obvious. Keeping all these points in view, the following questions are to be addressed in this article:

1. How much the process of opinion-making has changed and what are its bases?
2. What are the shortcomings of a Preacher in modern times and how they affected social communications?
3. Why is it necessary to train a Preacher about the individual and social norms of modern days?

**KEY WORDS:**

*Da'wah, Preaching, Modern trends of Da'wah, Qualities of a Preacher.*

دعوت و تبلیغ کے جدید اسالیب کے پس منظر میں مختلف جہات میں بہت سی کتب و مقالات تحریر کیے گئے ہیں جن میں زیادہ تر دعوتی اخلاقیات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ باوصف اس کے کہ داعی کی ذات اور اس کی تربیت سے متعلقہ امور پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے مگر اس کو زیادہ جامع انداز میں محور بنانے کی ضرورت ہے۔ چونکہ اہل علم کے لیے اس پر

* وزٹنگ لیکچرر، یونیورسٹی آف سرگودھا، سب کیمپس بھکر

** اسسٹنٹ پروفیسر، یونیورسٹی آف سرگودھا، سب کیمپس، بھکر

مزید گفتگو کی گنجائش وضرورت ہے لہذا اس مقالہ میں ان میں سے چند جہات پر بات کی گئی ہے۔

## دعوت کا فن اور سیرت نبوی ﷺ

### آدابِ مکالمہ

مکالمہ کو دعوت دین کے لیے سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ طرز تخاطب ہے جو لوگوں پر پیغام کا اچھا یا برا اثر چھوڑتا ہے۔ دعوت کے منہج نبوی میں مکالمہ روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ حتی کہ ایک اچھے مکالمے کے لیے آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو دیگر مذاہب کے لوگوں کی زبان سیکھنے کی بھی تاکید کی۔

عصر حاضر میں دعوت دین کے شعبے کے ساتھ جڑے ہوئے بعض لوگ اس لیے وہ مطلوبہ نتائج اخذ نہیں کر پاتے کیونکہ وہ مکالمہ کے فن اور اس کی اہمیت سے نابلد ہوتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور منہج دعوت سے پتہ چلتا ہے کہ مکالمہ بلا تفریق تمام طبقات و مذاہب کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ مثال کے طور پہ یہود کے ساتھ آنحضرتؐ نے ان کے انکار اور دشمنی کے باوجود بقائے باہمی کی بنیاد پر "میثاق مدینہ" کی صورت میں اکٹھے رہنے کا معاہدہ کر لیا تھا۔ [1] اس بقائے باہمی کا فیصلہ میثاق مدینہ کی تشکیل بھی مکالمہ بین المذاہب کی ایک عملی شکل تھی۔ اس کے علاوہ یہودیوں کے ساتھ مذہبی معاملات پر باہمی گفتگو کے بارے میں مختلف روایات حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں جن میں خاص طور پر وہ روایت قابل ذکر ہے جس میں تورات میں زنا کی سزا کے بارے میں یہودی علماء کے ساتھ جناب رسول اکرمؐ کی گفتگو کا ذکر کیا گیا ہے [2]۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہودیوں کے تین قبائل آنحضرتؐ کے انتظار میں تھے۔ بنو قینقاع، بنو نظیر اور بنو قریظہ۔ تینوں یہودی قبائل تھے جو اس سے پہلے پیغمبر آخر الزمان کا نام لے کر اور ان کا حوالہ دے کر دشمنوں پر رعب جمایا کرتے تھے اور نبی آخر الزمانؐ کی برکت سے جنگوں میں فتح کی دعائیں کیا کرتے تھے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو یہودیوں نے آپؐ کو پہچاننے کے باوجود آپؐ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور دشمنی پر اتر آئے۔ [3] تاریخ کا عجیب سا سوال ہے کہ جب مدینہ منورہ کے یہودی پیغمبر آخر الزمانؐ کا انتظار کر رہے تھے اور تشریف آوری پر پہچان بھی لیا تھا تو پھر انکار کیوں کر دیا؟ اس سوال کا جواب ہمیں قیصر روم اور (حضرت) ابو سفیان (رضی اللہ عنہ) کے اس مکالمے میں ملتا ہے جو بخاری شریف میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اور جس میں قیصر روم نے صاف طور پر کہا تھا کہ ابو سفیان نے میرے سوالات کے جواب میں جو کچھ کہا ہے اگر یہ درست ہے تو حضرت محمدؐ واقعتاً نبی ہیں، مجھے بھی پیغمبر آخر الزمان کا انتظار تھا اور لگتا ہے کہ یہ وہی نبی ہیں، لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ آخری پیغمبر عرب کے بدوؤں میں پیدا ہو جائیں گے۔ [4] گویا بنی اسرائیل کی طرف سے خواہ وہ یہودی ہوں یا

عیسائی، آنحضرتؐ کے انکار اور آپؐ کو قبول نہ کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ آپؐ عربوں میں پیدا ہوئے تھے اور بنی اسرائیل کے لیے نسلی عصبیت کی وجہ سے عربوں میں پیدا ہونے والے نبی آخر الزمان کو قبول کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

مسیحیوں کے ساتھ ہمارا اس دور کا سب سے بڑا مکالمہ نجران سے آنے والے مسیحی علماء و مشائخ کے ساتھ جناب رسول اکرمؐ کی گفتگو ہے۔ انہیں آنحضرتؐ نے پورے اعزاز اور پروٹوکول کے ساستھ مسجد نبویؐ میں ٹھہرایا اور کئی روز تک ان سے توحید خداوندی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت پر گفتگو ہوتی رہی جو کسی نتیجے تک نہ پہنچی تو مباہلہ کی نوبت آگئی۔ مگر جناب نبی اکرمؐ کی طرف سے مباہلہ کی دعوت کو مسیحی علماء نے قبول نہ کیا اور جزیہ وماتحتی پر معاہدہ کر کے وہ واپس نجران چلے گئے۔[5]

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں مختلف مذاہب کے ساتھ مکالمے اور گفتگو کے چند واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، آج بھی ہمارے لیے دعوت دین کے معاملے میں یہی راہنما اصول ہیں۔

## متنازعہ موضوعات سے احتراز

دین اسلام کا بنیادی وصف یہ ہے کہ یہ امن وآشتی کی دعوت دیتا ہے۔ یہ اسلوب قرآن کریم کے منہجِ دعوت اور آنحضرت ﷺ کے اُسوہ حسنہ میں واضح طور پر عیاں نظر آتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال وہ آیت کریمہ ہے جس میں اللہ عزوجل نے اہل کتاب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ"[6]

ترجمہ: ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے۔

یہ آیت کریمہ ادیان کے مابین ہم آہنگی کو فروغ دینے اور مکالماتی فضا کو تشکیل دینے میں ایک ایسی مثال ہے جو صرف قرآن کریم اور دین اسلام کا خاصہ ہے کہ اس نہج اور اس نوع کی دعوت کا اسلوب کسی اور مذہب یا ثقافت میں نہیں ملتا۔ یہ دراصل مشترکات کی دعوت ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یکطرفہ مفاہمت کی جائے بلکہ یہ ہے کہ مخاطب کو پہلے داعی کے اخلاق کے ذریعے ہم آہنگ بنایا جائے اور قریب لایا جائے۔ علماء نے دعوت کے جو اسالیب بیان کیے ہیں ان میں مخاطب کو اپنی طرف راغب کرنے کو بہت اہمیت دی گئی ہے[7]۔ اسی کو موعظہ حسنہ سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ دوسرے سے اختلافات کے باوجود اس کو اپنے اخلاق اور طریقِ تکلم سے متاثر کیا جائے کہ وہ پہلے بات سننے کی طرف راغب ہو۔ علماء کرام نے وعظ اور تعلیم کے مابین فرق کو بیان کیا ہے۔ وعظ دعوت کا حصہ ہے اور اس میں ترغیب کا منہج استعمال کیا جاتا ہے جس میں متنازکہ موضوعات تے احتراز بھی شامل ہے، جبکہ تعلیم اس کے بعد کا مرحلہ ہوتا ہے جس میں ایک دین کی جانب رغبت رکھنے والے شخص کی مذہبی عقائد وعبادات کے امور میں رہنمائی کی جاتی ہے۔

جناب رسول کریم ﷺ کی سیرت حسنہ سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ جب بھی آپ ﷺ نے مخالفینِ اسلام یا دین سے ناواقف لوگوں کو دعوت دینا چاہی تو اس امر کا خیال رکھا کہ ان براہ راست ایسے موضوعات پر گفتگو نہ کی جائے، بلکہ انہیں انسانی احترام اور باہمی مصالحت و مفاہمت کا پیغام دیا جائے۔ چاہے اس کا اسلوب قولی ہو یا عملی۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جو رسول اللہ ﷺ کے کسی خیر خواہی کے عمل سے اسلام لے آئے۔ یہ بھی دعوت کا ایک مؤثر اسلوب ہے جس میں علمی و مختلف فیہ موضوعات کو زیر بحث لانے کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ نے اگر قولاً بھی کسی کو دعوت دی تو اس میں بھی ترغیب و فلاح کا پیغام دیا۔ اس کی ایک مثال نجران کے عیسائی وفد سے آپ ﷺ کا معاملہ ہے کہ ان کے ساتھ آپ ﷺ قولاً و عملاً اس طرح پیش آئے کہ انہیں احساس ہی نہ ہوا کہ انہیں ان کے مذہب سے الگ ایک اور مذہب کی دعوت دی جارہی ہے۔ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ معاہدے میں یہ سطور لکھوائیں:

ولنجران وحاشيتها جوار الله وذمة مُحَمَّد النَّبِيّ رَسُول اللَّهِ عَلَى أنفسهم، وملتهم، وأرضهم، وأموالهم. وغائبهم وشاهدهم وعيرهم وبعثهم. وأمثلتهم لا يغير ما كانوا عَلَيْهِ ولا يغير حق من حقوقهم. وأمثلتهم لا يفتن أسقف من أسقفيته. ولا راهب من رهبانيته. ولا واقه من وقاهيته عَلَى ما تحت أيديهم من قليل أو كثير، وليس عليهم رهق ولا دم جاهلية، ولا يحشرون ولا يعشرون۔ [8]

ترجمہ: اہل نجران اور اس علاقے کے مضافات میں بسنے والے لوگوں کے جان، مال، ان کا مذہب، زمینیں، ان کا حاضر و غائب، ان کا وفد، ان کے سفیر، ان کی خواتین، سب کچھ اللہ اور اس کے رسول کی امان میں متصور ہوں گے۔ ان کی موجودہ حیثیت میں کوئی تعرض و تغیر نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے حقوق میں کوئی کمی کی جائے گی۔ ان کے بت نہیں توڑے جائیں گے، ان کی عبادت گاہوں کے منتظم اپنے مناصب سے ہٹائے نہیں جائیں گے۔ ان لوگوں کے پاس جو کچھ بھی کم یا زیادہ ہے وہ ایسے بدستور رہے گا۔ ان سے جاہلی عصر کے کسی جرم کا بدلہ نہیں لیا جائے گا۔ نہ انہیں ظلم کرنے دیا جائے گا نہ ان پر ظلم کیا جائے گا۔

اس معاہدے کی شقوں پر نظر ڈالنے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے منہج دعوت میں انسانی دوستی اور مفاہمتی عمل کی کتنی اہمیت تھی۔

سیرت نبوی (ﷺ) کے مطالعہ سے ایسے بے شمار شواہد اور واقعات ملتے ہیں جن کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مسلموں اور غیر مسلموں کو قریب لانے اور ہر دور میں ہم آہنگی کے فروغ کو سرکار دو جہاں ﷺ کتنی زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ آج جب ہماری بعض نادانیوں اور اسلام کی غلط تفہیم سے پیدا ہونے والے فتنۂ دہشت گردی کی وجہ سے دُشمنانِ اِسلام دُنیا کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اسلام اور دُنیائے جدید ایک دوسرے سے متصادم دو قوتیں ہیں [9]۔ یہ بھی

کہ مسلمان سوائے اہلِ اسلام کے باقی سب کو فالتو مخلوق سمجھتے ہیں اور اُن کیساتھ میل جول کو گناہ تصور کرتے ہیں۔ اِس طرح کی بہت سی دیگر بحثیں ان دنوں دُنیا میں طول پکڑ رہی ہیں، ایسے میں ہمیں سیرتِ پیغمبرِ دینِ مُبین میں جھانک کر اپنے لئے راستہ تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور سیرتِ پاک کی روشنی میں دُنیا کو یہ باوَر کروانے کی ضرورت ہے کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کل عالمین کیلئے رحمت بن کر آئے اور آپ ﷺ کا دین بھی عالمین کیلئے رحمت ہے[10]۔

## معاشرتی پہلوؤں کی رعایت، سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں

### ثوابت ومتغیرات اور سماج کے ذہنی رجحانات کا خیال:

دعوت دین کا تعلق چاہے مسلمانوں کے ساتھ ہو یا غیر مسلموں کے ساتھ، اس میں ایک اہم امر یہ بھی ہے کہ دعوت کے تناظر میں جن چیزوں پر زور دیا جارہا ہے ان کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ مسلم فقہاء اور مفکرین نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ دین میں کچھ امور ثوابت کا درجہ رکھتے ہیں جو کبھی بھی اور کسی زمانے میں بھی تبدیل نہیں کیے جاسکتے جبکہ کچھ امور متغیرات میں سے ہوتے ان کے حوالے سے بھی داعیان دین کو علم ہونا چاہیے۔ تاکہ ثوابت ومتغیرات کا علم ہو گا تو دعوت کا طریق کار بھی زیادہ مؤثر ہو گا۔

بالخصوص سماج کے انتظامی سماجی معاملات سے تعلق رکھنے والے امور میں داعی کو ثوابت و اتغیرات کا علم ہونا چاہیے، اگر اسے ان کا پتہ نہیں ہو گا تو وہ بعض اوقات ایسی چیزوں میں شدت اختیار کرے گا جو متغیرات سے ہیں یا ان میں امور میں نرمی برتے گا جو ثوابت ہیں تو اس سے اسلام کی تعلیم کا صحیح تعارف نہیں ہو گا۔[11]

اس حوالے سے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں صحابہ کرام کے ساتھ مشاورت کو دلیل کے طور پہ پیش کیا جاسکتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج میں کئی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو متغیرات ہوتے ہیں جن میں مشاورت کو اساس بنایا جاسکتا ہے جو وقت کے اعتبار سے تبدیل بھی ہوسکتے ہیں۔

مثال کے طور پہ آنحضرت ﷺ نے مدینہ تشریف لے آنے کے بعد انتظامی امور میں جو سیاسی فیصلے اور احکامات جاری فرمائے ان کی اکثریت کا صدور وقتی حاجت کی وجہ سے ہوا۔ اور ان میں آپ نے اہل مدینہ سے مشورہ بھی طلب کیا جس میں انہیں اتفاق یا اختلاف کی مکمل آزادی حاصل تھی[12]. ایسا شاذونادر ہی ہوا کہ کسی انتظامی معاملے میں وحی الٰہی کا نزول اس کے متعلق عمل یا فیصلے کے صدور سے پہلے ہوا ہو۔

آنحضرت ﷺ کا بیعت کے ذریعے انتخاب اور اس کے بعد آپ کا صحابہ کرام سے مشورہ کرکے سیاسی رائے قائم کرنا، فیصلہ صادر کر دینا اور اس کے بعد توثیق یا تبدیلی کے لیے آیت کا نازل ہونا اس مر کی دلیل ہے کہ انتظامی معاملات میں غیر متغیر و حتمی احکامات دینے کی بجائے شریعت کا مزاج مسلمانوں میں جائز مشاورت کو فرغ دینے کا ہے۔ شورائیت کو قانون بنانا اور اس کے بعد فیصلے پر رائے کا اظہار کرنے کا مقصد تربیت کرنا تھا کہ داخلہ وخارجہ کے انتظامی معاملات میں

کن مصالح کی رعایت رکھنی ضروری ہے۔ ان مصالح و مقاصد کی رعایت رکھتے ہوئے انسانی عقل و تدبر کے ذریعے امور سلطنت میں فیصلے کرنے کی اجازت مشروع ٹھہرے گی۔ تاریخ القضاء فی الاسلام میں وہبہ الزحیلی لکھتے ہیں کہ بعض اوقات آپ اپنی موجودگی میں ہی کسی صحابی کو اجتہاد کے ذریعے فیصلہ کرنے کی ذمہ داری بھی سونپ دیتے تھے[13]۔

صحابہ اکرامؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ بہت زیادہ مشورہ کرنے والے تھے غزوہ احد میں آپ ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ مدینہ میں رہ کر لڑا جائے یا مدینے سے باہر۔ صحابہ اکرامؓ کی اکثریت نے مدینے سے باہر قتال کرنے کا حکم دیا آپ ﷺ کی اپنی رائے تھی کہ مدینہ کے اندر رہا جائے لیکن امت کی اکثریت کو اہمیت دیتے ہوئے آپ ﷺ نے اپنی رائے پر عمل نہیں کیا۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ بھی امت کی رائے کو ترجیح دے رہے ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ صحابہؓ کی اکثریت نے آپ ﷺ کی رائے کے خلاف مشورہ دینے میں حرج محسوس نہیں کیا کیونکہ انہیں علم تھا کہ خدا اور رسول نے انہیں مباح امور میں اختلاف کا حق دیا ہے[14]۔

بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر تہتر مرد اور دو عورتیں شامل تھے، اس وقت آپ ﷺ نے ان سے فرمایا تھا کہ وہ اپنے اپنے قبائل کے نمائندے منتخب کر لیں جنہیں نقباء کا نام دیا گیا۔ اہل مدینہ نے بارہ نمائندے منتخب کر دیے جن میں سے نو خزرج کے اور تین قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ مسلمانوں کی تاریخ کی پہلی منتخب مجلس شوری تھی[15]۔

ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ سماجی جہات کی رعایت اور ان کے ضمن میں لوگوں کے ساتھ جائز مشاورت سیرت نبوی ﷺ کا نمایاں وصف ہے جس کی رعایت دعوت و تبلیغ کے شعبوں میں بھی ضروری ہے۔

جدید دور میں ایک اور امر جس پر داعیان دین کو توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ جدید سماج کی ذہنی ساخت سے بھی تعارف ہونا چاہیے۔ بہت سارے داعی جن کا جدید معاشرے کی نفسیات، زبان اور کلچر سے کوئی معلومات کا ربط بھی نہیں ہوتا وہ جب میدان میں آتے ہیں تو مخاطبین کے دلوں تک نہیں پہنچ پاتے اور مقصد میں ناکام رہتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ اس عدم واقفیت کی بنا پر وہ اس طرح تعامل کرتے ہیں کہ اس سے دین اسلام کے بارے میں منفی تاثر پیدا ہو جاتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ داعی جدید سماج کی ذہنی ساخت سے بھی پوری طرح تعارف رکھتا ہو۔

اسی طرح ثقافتی تنوع اگر مذہبی اقدار کے متصادم نہیں ہے تو اس کو برقرار رہنے دیا جانا چاہیے۔ معاشروں کا ثقافتی تنوع اس دنیا کی حقیقت ہے، یہ ہمیشہ رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ جس طرح ایک عام آدمی کے لیے اس حقیقت کو قبول کرنا ضروری ہوتا ہے ایسے ہی داعی پر بھی لازم ہے کہ وہ اس حقیقت کو قبول کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سارے داعی یہ خیال کرتے ہیں کہ ثقافتی تنوع ایک منفی شے ہے اور سمجھتے ہیں کہ معاشروں کے ثقافتی تنوع کو بھی ختم کر کے ایک کرنا چاہیے[16]۔

## مخاطب کے حالات وظروف کی رعایت

جس طرح وہ علماء جن کا کام دینی مسائل میں راہنمائی کرنا ہوتا ہے ان پر فرض ہے کہ وہ زمانی حاجت اور مصلحتِ عامہ کا اصول اپنے ذہن میں رکھیں اور اسی کے آئینے میں احکامات کا استخراج کریں۔ اسی طرح داعیان دین کا بھی فریضہ ہے کہ وہ حالات وظروف کی رعایت رکھیں۔

حالات کے فرق کی اہمیت کا اندازہ امام شافعیؒ کے اس قول سے لگایا جاسکتا ہے، آپؒ فرماتے ہیں پیغمبرِ اسلام کسی قضیے میں ایک سنت متعین کرتے ہیں پھر دوسرے وقت میں اس سے مختلف سنّت بیان کرتے ہیں لیکن بعض سامعین یہ نہیں سمجھ پاتے کہ دونوں کے حالات الگ الگ تھے۔ امام شافعی لکھتے ہیں:

"وسنّ ﷺ فی الشئ سنّةً وفیما یخالفه اخریٰ فلایخلص بعض السامعین بین اختلاف الحالین اللتین سنّ فیهما"[17]

حالات کے فرق کا لحاظ کرتے ہوئے آپ ﷺ کا مختلف احکامات جاری کرنا امّت کے لئے ہدایت ہے کہ ضرورت کے وقت احکامات میں تبدیلی کی جاسکتی ہے اس شرط کے ساتھ کہ حکم اسلام کی روح کے منافی نہ ہو اور اس میں اجتماعی بہبود مقصود ہو۔ اس پر صحابہ اکرامؓ اور بعد کے فقہاء کا طرزِ عمل بھی شاہد ہے۔ کئی قیاس موجود ہیں جن میں معتبر حضرات نے نصوص کے برعکس فتویٰ دیا یہاں چند مثالیں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بخاری ومسلم کی صحیح حدیث ہے جسکا مفہوم ہے آپ ﷺ سے بھٹکی ہوئی اونٹنی کے متعلق سوال کیا گیا کہ اگر ایسی اونٹنی مل جائے تو اسے پکڑ لیا جائے یا آزاد رہنے دیا جائے آپ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا:

"مَا لَكَ وَلَهَا، مَعَهَا سِقَاؤُهَا وَحِذَاؤُهَا، تَرِدُ المَاءَ وَتَأْكُلُ الشَّجَرَ حَتَّى يَلْقَاهَا رَبُّهَا [18]

ترجمہ: تمہیں اس سے کیا غرض، اس کے ساتھ اسکا پانی اور پیر ہیں وہ پانی پیتی ہے اور درخت سے کھاتی ہے یہاں تک کہ اسے اس کا مالک مل جائے۔

اس حدیث کے مطابق بھٹکی ہوئی اونٹنی کو پکڑنا درست نہیں ہے جبکہ بیہقی میں حضرت عثمانؓ کا فتویٰ اس کے خلاف موجود ہے۔ آپؓ کا فرمان ہے ایسی اونٹنی کو پکڑ کر اس کے بارے میں اعلان کیا جائے اگر مالک نہ ملے تو اسے بیچ دیا جائے پھر جب بعد میں مالک کا علم ہو تو اسے اونٹنی کی رقم ادا کر دی جائے[19]۔ حضرت عثمانؓ نے صحیح حدیث کی موجودگی کے باوجود اس کے مخالف فتویٰ دیا۔ اسکی توجیہ بعض علماء نے یہ پیش کی کہ حالات کے مختلف ہونیکی وجہ سے حضرت عثمانؓ نے حدیث کے برعکس فتویٰ دیا اگر ملک میں عدل وایمانداری ہو تو اونٹنی کو آزاد رہنے دیا جائے اور اگر عدل وایمانداری مفقود ہو تو اسے پکڑ کر بیچ دیا جائے اور مالک کے ملنے پر اسے رقم کی ادائیگی کر دی جائے تاکہ اس کے چوری ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔

زمان و مکان کے تابع رہنا ہی قدرت الٰہی کا فیصلہ اور چاہت ہے۔ کوئی بھی اجتماعی نظم ایکدم عدم سے وجود میں نہیں آتا انسانی تجربات ہی نظم کو وجود دیتے اور تخلیق کرتے ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ جب مدینہ میں آئے تو آپ نے صرف اقدار کی جگہ اقدار پیش کیں اور وہ بھی آہستہ آہستہ [20]، اس کے علاوہ انتظامی امور تو جیسے تھے ایک حد تک ویسے ہی رہے، اگر کہیں کہیں تبدیلیاں ہوئیں تو وہ بھی مشاورت کے ساتھ۔ عصر حاضر کا زمان و مکان مختلف ہے۔ سائنسی، معاشی، سماجی، سیاسی امکانات اور تقاضے بھی الگ ہیں لہذا اسلامی اقدار کی رعایت رکھتے ہوئے ہمارے اجتماعی نظم کا دھانچہ بھی ماضی سے کچھ امور میں الگ ہو سکتا ہے جس کی رعایت رکھنی ضروری ہے۔

## جدید ذرائع ابلاغ کے استعمال کا سلیقہ

عصر حاضر میں ہر شعبے نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ اب ان سے متعلقہ وسائل وآلات بھی مکمل طور پہ تبدیل ہو چکے ہیں۔ انہی میں سے ایک ذرائع ابلاغ کا شعبہ بھی ہے۔ یہ شعبہ اتنا اہم ہے کہ دنیا کے تقریباً تمام دیگر شعبے اپنی ترقی میں اس سے مدد لیتے ہیں۔ انفرادی طور پہ بھی لوگوں کے اندر خاندان اور تعلیمی اداروں کے بعد ذرائع کا کردار بہت اہم ہے۔ یہ شعبہ رائے سازی کا بڑا پلیٹ فارم ہے۔ دعوت و تبلیغ کے لیے بھی اب ان جدید ذرائع ابلاغ کا استعمال نہایت پروری ہے۔ [21] لیکن ابلاغیات کے جدید وسائل کے استعمال کا طریقہ اس سے الگ ہے جو قدیم طریقوں میں استعمال ہوتے تھے۔ لہذا ان کا سیکھنا اور ان سے ہر طرح سے تعارف پیدا کرنا اہم ہے۔ بہت سے لوگ دعوت و تبلیغ کے لیے ان ذرائع کے استعمال کو اہمیت نہیں دیتے جس کا نقصان ہوتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے سیاسی جماعتوں کے تحرک کا مشاہدہ کرنا چاہیے کہ اب ان کی ساری توجہ سوشل میڈیا اور جدید ذرائع ابلاغ کی جانب ہے۔ رائے کا سازی کا عمل اب ذرائع ابلاغ کے جدید وسائل کی مدد سے انجام پاتا ہے جس کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا [22]۔

> ”رائے عامہ کی تشکیل ایک مسلسل عمل ہے۔ یہ سوشل میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ کے توسط سے ہر جگہ اور ہر وقت ہو رہا ہوتا ہے۔ علما، اساتذہ، میڈیا، والدین، ریاست، گلی محلہ، سب اپنی اپنی جگہ رائے عامہ کی تشکیل میں لگے ہوئے ہیں۔ ہمہ وقت مختلف افراد یا طبقات کے بارے میں کوئی نہ کوئی رائے پیش کی جارہی ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے اذہان میں کوئی نہ کوئی نقطہ اتارنے کی کوشش کی جارہی ہوتی ہے۔ اسی طریقے سے رائے عامہ کی تشکیل ہوتی ہے“ [23]۔

دعوت دین کی ضرورت ہے کہ ان وسائل کو دینی کاموں میں بھی بھرپور طریقے سے استعمال کیا جائے۔ داعی اپنی دعوت پیش کرنے کے لئے ان میں سے کس ذریعے کو کہاں استعمال کرے، اس کا انحصار اس کے دعوتی مقاصد، دعوت کی وسعت، مخاطبین کی تعداد اور دعوتی پیغام کی نوعیت پر ہے۔ ہمارے معاشرے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دعوت دین کے ان جدید وسائل کو استعمال کرنا بے برکتی کا باعث ہے [24]۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام وسائل کو شیطانی اور

طاغوتی قوتیں اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کر رہی ہیں مگر دینی کاموں میں ان کا عشر عشیر بھی استعمال بھی نہیں ہو رہا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ شیطانیت تو آج گھر گھر اپنے پنجے گاڑ چکی ہے مگر اسلام صرف مسجد اور مدرسہ میں مقید ہو کر رہ گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ سے بھی ہمیں اس کی تعلیم ملتی ہے۔ جس طرح کہ آپ ﷺ کے عہد میں عوام سے مخاطب ہونے کے چند ذرائع تھے، ان میں سے ایک پہاڑی پر چڑھ کر قبیلے کو خاص الفاظ بول کر بلانا اور اس کے بعد پیغام سنانا، جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور لوگوں کو ویسے ہی طریقے سے دعوت دینے کے لیے متوجہ کیا۔[25]

اسی طرح لوگوں کی بڑی تعداد سے مخاطب ہونے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ سالانہ حج کے موقع پر سوق عکاظ میں لوگوں سے خطاب کیا جاتا یا بات پہنچائی جاتی تھی۔ آپ ﷺ نے بھی یہ طریقہ استعمال کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور کے طرز تخاطب کے وسائل کو استعمال میں لانا چاہیے تاکہ دعوت کا کام جاری رہے۔[26]

## نتائج وحاصلات

1. عصر حاضر میں رائے سازی کے عمل کا سب سے بڑا وسیلہ جدید ذرائع ابلاغ کا ہے جسے دعوت کے شعبے میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔
2. داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ سماج، بالخصوص نئی نسل کے ذہنی رجحانات سے بخوبی واقفیت حاصل کرے اور دعوت کے عمل میں اس کو مد نظر رکھے۔
3. دعوت و تبلیغ کے عمل کے دوران متنازعہ موضوعات سے احتراز کیا جائے۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس طبقے سے مخاطب ہونے کا ارادہ کیا جائے پہلے اس مقام اور وہاں کے دینی و معاشرتی تناظر کا اچھی طرح تعارف حاصل کیا جائے تاکہ ان سے ہم آہنگی اور میل جول آسان و خوشگوار ہو سکے۔
4. عصر حاضر میں دعوت کے عمل کے لیے متکلم کا تعین کر دیا جائے اور اس کے لیے صاحب علم و فراست شخص کا انتخاب ہو۔
5. مخاطب کے حالات و ظروف کی رعایت رکھی جائے۔ اس لیے داعی کا ادارہ جاتی وانتظامی امور میں ماہر ہونا بھی ضروری ہے۔

## حواشی وحوالہ جات

1۔ علی محفوظ، شیخ، ہدایۃ المرشدین، دارالاعتصام، بیروت، 2014ء، ص 21

2۔ احمد امین، فجر الاسلام، دار الکتاب العربی، بیروت، 2003ء، ص70

3۔ علی عبد الحلیم، محمود، منہج الدعوۃ الی اللہ، دار الوفاء، قاہرہ، 2000ء، ص155

4۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، دار طوق النجاۃ، بیروت، 1422ھ، بَابُ بَدْءِ الوَحْيِ، حدیث نمبر: 7، 1/8

5۔ دیکھیے: البلاذری، أحمد بن یحیی بن جابر، فتوح البلدان، دار ومکتبۃ الھلال، بیروت، 1988ء، ص72

6۔ آل عمران: 3/64

7۔ القحطانی، سعید بن علی، فقہ الدعوہ فی صحیح البخاری، مکتبہ وھبہ، الریاض، 2011ء، 1/44

8۔ البلاذری، فتوح البلدان، ص72

9۔ عبد اللہ علوان، صفات الدعوۃ النفسیۃ، دار الریان، بیروت، 2018ء، ص66

10۔ عبد الملک بن ہشام، السیرہ النبویہ، دار الشروق، بیروت، 2006ء، 4/221

11۔ عبد الکریم الخطیب، السیاسہ العالیہ فی الاسلام، المعتبہ العلمیہ، بیروت، 1998ء، ص7

12۔ احمد شلبی، السیاسہ فی الاسلام، دار النھضہ، اسکندریہ، 2004ء، ص12

13۔ السمعانی، منصور بن احمد، قواطع الادلہ فی اصول الفقہ، مکتبۃ التوبہ 1988ء، 4/83، میں متعدد مثالیں ایسی ذکر کی گئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو اپنی موجودگی میں اجتہاد کرنے کا حکم دیا۔ انہی میں سے ایک مثال یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ایک بار عمرو بن العاص کو دو لوگوں کے درمیان کسی مسئلے پر اختلاف کے نتیجے میں اجتہاد کر کے فیصلہ کرنے کا حکم دیا، عمرو بن العاص نے کہا: أأجتھد وأنت حاضر؟ (کیا میں آپ کے ہوتے ہوئے اجتہاد کروں؟) قال نعم (آپ نے جواب میں فرمایا: ہاں)۔

14۔ ایضاً، 133

15۔ فالح حسین، بحث فی نشاۃ الدولہ الاسلامیہ، مرکز دراسات الوحدہ العربیہ، بیروت، 2010ء، ص41

16۔ سید محمد ساداتی، رکائز الاسلام، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، 2006ء، ص180

17۔ امام شافعی، الرسالہ، تحقیق احمد شاکر، دار الکتب العلمیہ بیروت، ص144

18۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب المساقاۃ، باب: لا حمی إلا للہ ولرسولہ صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث: 2372، 3/109

19۔ ابن عبد البر، الاستذکار، المکتبہ العلمیہ، بیروت، 1993ء، 7/255

20۔ عبد الکریم زیدان، اصول الدعوہ، ص211

21۔ سید محمد ساداتی، رکائز الاسلام، ص77

22۔ عبد اللہ علوان، صفات الدعوۃ النفسیۃ، ص122

23۔ ایضاً، ص217

24۔ ایضاً، ص214

25۔ التمیمی، احمد بن علی، مسند ابی یعلی، المکتب الاسلامی، بیروت، 2004ء، 2/159

26۔ طاہر بن عاشور، التحریر والتنویر، دار الکتاب اللبنانی، بیروت، 2017ء، ص222